⊙ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ابلاغِ عامہ، سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی، کراچی

⊙⊙ طارق احمد

ریسرچ اسکالر، شعبہ ابلاغِ عامہ، جامعہ وفاقی اردو، کراچی

سرسید احمد خان اور 'تہذیب الاخلاق'
(فکرِ تازہ اور ذوقِ صحیح کی نمود)

Abstract:

Sir Syed Ahmad Khan emerged as a key leader of the Indian Muslim community after 1857. Although soon after 1857, he remained the follower of the unity of Muslims and Hindus and always referred to Indian nationalism but in the end it is he who has been credited for originating the two-nation theory followed by the Aligarh Movement. His famous magazine "Tehzeeb ul Akhlaq" promoted the same thesis. He made this magazine an effective instrument to acknowledge the theological link between Muslims and their colonial masters and to bring them close. He tried to uplift the thoughts of Muslim nation regarding culture, education, religion and politics through "Tehzeeb ul Akhlaq". A comprehensive review of Sir Syed's intellectual services and the task of "Tehzeeb ul Akhlaq" to fortify the Muslims of India in every aspect of life has been thrashed out in this paper.

Keywords:

SirSyed 1857 Tehzeeb-ul-akhlaq Tehzeeb Magazine Colonialism

ہندوستان ایسا قدیم خطہ ہے جو اپنے اندر صدیوں پرانی ثقافتی و ادبی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ اس خطے پر مختلف خاندانوں نے حکومت کی جن میں غزنوی، غوری، مملوک، خلجی، تغلق، سید، لودھی اور سب سے طویل مدت تک حکمرانی

کرنے والا مغلیہ خاندان شامل ہے۔ مغلوں نے تقریباً تین صدیوں تک برصغیر پر راج کرنے کے بعد ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے شکست کھائی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو اہل قلم اور مورخین اپنے اپنے طور پر 'بغاوت'، 'جنگ آزادی' اور 'غدر' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ زمانہ مسلمانانِ برصغیر کے لیے بہت کٹھن تھا۔ انگریز راج شروع ہو چکا تھا وہ اپنی طرز معاشرت کو تیزی سے رواج دے رہے تھے۔ لباس وضع قطع، علوم وفنون ہر طریقے سے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور معاشرتی اقدار کو پامال کیا جا رہا تھا جو کہ مسلمانوں کے لیے بے حد تکلیف دہ بھی تھا اور ان کے اندر ایک باغیانہ رویے کو بھی بڑھاوا دے رہا تھا۔ ایسے میں مسلمان جو کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے میں شمار ہوتے تھے انگریزوں کی بے التفاتی اور اپنی انا کی وجہ سے اپنی حیثیت سے نیچے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ معاشی مسائل سر اٹھانے لگے۔ اب ان کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں یا تو اس استحصال کو قبول کر لیں یا پھر انگریزوں کو حکمراں تسلیم کر کے ان کی پالیسیوں کو اپنا لیا جائے۔ ایسے میں بہت سے اکابرین اور علمائے کرام میدان میں اترے اور مسلمانوں کی سماجی وفلاحی اصلاح کے لیے کوششیں کیں۔ انہیں اکابرین میں ایک نمایاں نام سرسید احمد خان کا ہے۔ سرسید نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ مسلمانانِ ہند کی تنزلی کا دور تھا۔ ایک چیز جو باقی تھی وہ اسلامی علوم وفنون کے مراکز اور درس گاہیں تھیں بالخصوص دہلی ایسے تمام اداروں کا گڑھ تھا۔ جہاں علماء ومشائخ کی بڑی تعداد موجود تھی جو تشنگان علم کی دینی اور اخلاقی ضروریات کی سیرابی کرتے رہتے تھے۔ مسلمانانِ برصغیر اپنے علوم وروایات پر نازاں اور مطمئن تھے بدلتی دنیا کے تقاضوں اور مغربی علوم وفنون سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس صورت حال کو قاضی جاوید نے یوں قلم بند کیا ہے:

> ''غیر ملکی آقاؤں سے تعلق استوار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نوآبادیاتی نظام کو مکمل طور پر قبول کیا جائے اور اس کے جملہ تقاضے پورے کیے جائیں لیکن اس نظام کے اندر دونوں طبقات کے درمیان کوئی انسانی رشتہ ممکن نہیں تھا۔ اس معروضی صورتِ حال میں جب ہندوستان کے متوسط اور بالائی طبقوں نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی تو انھیں اس صورت حال کے جبر کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا پڑا۔ اول اول سرسید احمد خان ان طبقات کے نظریہ ساز اور رہنما کی حیثیت سے ابھرے۔''(۱)

اس زمانے میں علی گڑھ تحریک ہندوستان کے دورِ بیداری کی ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حالات کا ساتھ دینا، وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور مایوسی کے چنگل سے نکلنا سکھایا تھا۔ ان کے اصلاحی مشن نے مسلمانوں کو طرزِ کہن پر اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے سے بچایا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو جاگیردارانہ تصورِ حیات سے نکال کر جدید صنعتی دور کی طرف متوجہ کیا۔ علی گڑھ نے اپنے محدود حالات میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے وہ کچھ حاصل کر لیا جو ہندوستان کے تاریخی وسماجی ارتقا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید احمد خان کے دور میں یورپی افکار میں سب سے زیادہ اہمیت عقل پسندی کو حاصل تھی جو یورپ سے ہندوستان پہنچی۔ اس طرح نیچرل اور فطرت کی اصطلاح بھی یورپ سے ذہن وفکر کی سب سے بڑی کلید بن گئی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے اہل مغرب کی طرح نہ صرف اس کا استعمال کیا بلکہ بڑی مدت تک اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔ خصوصاً سرسید، حالی اور شبلی پر اس کے اثرات نمایاں شکل میں

نظر آتے ہیں۔ ترقی اور ارتقاء کے ان نظریوں سے سرسید اور ان کے رفقا بھی بے حد متاثر ہوئے مگر سرسید کو ارتقا سے زیادہ 'ترقی' کی اصطلاح مرغوب ومحبوب تھی۔ اس زمانے میں اجتماعیت، سولیزیشن، تہذیب اور کلچر کے مغربی تصورات نے بھی خاص اثر دکھایا بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا ہندوستان میں جدید نظریہ تہذیب کے سب سے بڑے مبلغ اور داعی تھے اور اس بات کی تصدیق رسالہ 'تہذیب الاخلاق' سے ہوسکتی ہے (۲)۔ وہ اپنے دور کے علما میں سے غیر روایتی اور کسی حد تک آزاد خیال اور روایت شکن تھے لیکن ان کا بنیادی مقصد اصلاح معاشرہ تھا۔ وہ فکر وعمل پر یقین رکھتے تھے، انقلابی نہیں تھے بلکہ مصلح تھے۔ انھوں نے اپنے لیے تحقیق کا راستہ چنا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ترقی کرنے کے لیے تحقیقی ذہن کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ سرسید کے اس طرز سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا اور ان کی عقلیت پسندی کو نہ صرف اپنایا بلکہ ترقی کی کلید جانا۔ بقول حامد حسن قادری سرسید کا خیال تھا کہ وہی مسائل انجام کو ہر دل عزیز ہوتے ہیں جو بعد مباحثہ قائم رہتے ہیں (۳)۔

سرسید کی علمی وادبی خدمات کا جب بھی جائزہ لیا گیا تو غیر محسوس طریقے سے ان کی شخصیت کا سیاسی پہلو ہر جگہ حاوی نظر آتا ہے اور ادبی حیثیت پسِ پشت چلی گئی اسی وجہ سے سرسید کا کردار کسی حد تک متنازعہ بھی رہا۔ ان کی تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ادب، مذہب، سماجیات، اقتصادیات، بین المذاہب ہم آہنگی پر بہت پر مغز اور وقیع مضامین لکھنے کے علاوہ ایسی کتب اور رسائل شایع کیے جو ان کی ممتاز ادبی حیثیت کا کھلا اظہار ہیں۔ ان کی تصنیفات نے انگریزوں کو بھی اسلام کی روشن خیالی اور وسعت النظری کا قائل کرنے میں مدد دی۔ ان کے تراجم اور تفاسیر نے اسلام مخالف پروپیگنڈا کی نفی کی اور اس مساعی کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر 'تہذیب الاخلاق' کو سب سے زیادہ استعمال کیا گیا۔ 'تہذیب الاخلاق' کچھ وقفوں کے ساتھ گیارہ سے بارہ برس جاری رہا۔ اس رسالے میں اس وقت کے پایے کے لکھاریوں نے مضامین لکھے اور سب سے زیادہ مضامین خود سرسید احمد خان نے لکھے۔ اس میں قومی، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی الغرض ہر شعبہ ہائے زندگی کے مضامین شایع ہوتے تھے اور ان کے اسلوب نگارش میں فکر وتخیل، منطق وفلسفہ، جوش وخروش، شوخی وظرافت ہر رنگ کا حسبِ موقع جلوہ ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری یہ اردو کا پہلا رسالہ نہیں تھا مگر مضامین میں جدت، رنگارنگی طرز بیان کے باعث یہ ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا (۴)۔ 'تہذیب الاخلاق' کا پہلا دور چھ سال کا تھا جس میں اس رسالے سے شدید اختلاف کیا گیا۔ لیکن سرسیّد جیسے صاحبِ دل، صاحبِ نظر اور صاحبِ خرد وعمل جس نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو بے حسی و بے عملی کی نیند سے جھنجھوڑ کر جگایا، انھیں اُمید کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ نفسانفسی کے زمانے میں ان کے ذہن میں ملک وقوم کا درد تھا سو اپنے آپ کو انھوں نے اصلاح وترقی کی کوشش میں لگا کر قومی خدمت کی جو زندہ مثال قائم کی اس کے عوض قوم نے انھیں 'نیچری کرسٹان' جیسے القاب سے نوازا۔

'تہذیب الاخلاق' کے ابتدائی عہد میں اس کا دھارا سیاسی زیادہ تھا اس کے باوجود اس نے ادب اور ادبی تنقید پر بھی کچھ کم اثر نہیں ڈالا۔ اس کے مضمون نگاروں نے مضمون کی سچائی پر بڑا زور دیا۔ ان مضمون نگاروں میں وقار الملک بھی تھے جنھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے لیے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ ان کے معروف مضامین میں 'توکل'، 'آپ کام مہا کام'، 'شیریں زبانی' اور 'تقوی' کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔ سید محمود بھی 'تہذیب الاخلاق' کے اہم مضمون نگاروں میں

سے تھے۔ انھوں نے صرف چند مضامین لکھے جن میں 'دوستی کا برتاؤ' اور 'کیمبرج یونیورسٹی' وغیرہ معروف ہوئے۔ ان مضامین کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر سید محمود اردو زبان کی ادبی خدمت کے لیے وقت نکالتے اور اردو ادب کو مستفیض فرماتے تو شاید اردو کے سرمائے میں بہت سی عمدہ، خیال آفرین اور روح پرور تحریروں کا اضافہ ہو جاتا کہ ان کا قلم محتاط اور حدود شناس ہونے کے باوجود جدت پیدا کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا حالی اور کثیر الجہات شخصیت مولوی ذکاء اللہ بھی ابتدائی دور کے مضمون نگاروں میں شامل تھے۔

'تہذیب الاخلاق' اپنے نام کی نسبت سے مؤثر رسالہ رہا۔ اس پرچے نے برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو کردار ادا کیا اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ تہذیب اخلاق نے جس حد تک مسلمانوں کی زندگی میں اپنے افکار و نظریات پیوست کیے وہ اس رسالے کی کامیابی سے آشکار ہے۔ سرسیّد نے جب 'تہذیب الاخلاق' ۲۷ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری کیا تو اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ (۵):

☆ اس رسالے کو نکالنے کا مقصد آزادیِ رائے ہے۔ جب تک مسلمانوں میں آزادیِ رائے پیدا نہیں ہوگی وہ تہذیب سے نا آشنا رہیں گے۔

☆ مذہبی عقائد کی درستی، مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کرنا، ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسے خیالات اور توہمات موجود ہیں جن کو وہ مذہبی افکار سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے لیے ایسا طریقۂ تعلیم متعین کرنا جس کے ذریعے دینی و دنیاوی اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جا سکے۔

☆ مسلمان عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔

سرسیّد نے مسلمانوں کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی زندگی کی اصلاح و ترقی کے لیے 'تہذیب الاخلاق' کے اجرا کے وقت مندرجہ ذیل بیس موضوعات کو قابلِ فکر قرار دیا (۶):

☆ خود غرضی ☆ عزت و غیرت ☆ ضبطِ اوقات ☆ اخلاق ☆ سچائی ☆ دوستوں سے راہ و رسم ☆ کلام ☆ لہجہ ☆ طریقِ زندگی ☆ صفائی ☆ طرزِ لباس ☆ کھانے پینے کے طریقے ☆ تدبیر منزل ☆ عورتوں کی بھلائی ☆ کثرتِ ازدواج ☆ غلامی ☆ شادی بیاہ کی رسومات ☆ غمی کی رسومات ☆ زرعی ترقی ☆ تجارت۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ قوم کی اصلاح و تجدید کا تصور سرسیّد کے ذہن میں کیا تھا اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی زندگی کے کن شعبوں پر بات کرنا چاہتے تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' کے اجرا کا ایک مقصد مسلمانوں کو انگریزی اور عصری تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے انگریزوں کے طور طریقوں سے روشناس کرانا بھی تھا۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ اگر انگریزوں سے تعصب کا رویہ رکھا گیا تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک غلط راستہ ہوگا۔ 'تہذیب الاخلاق' نے جس طرح مسلمانانِ ہند کی علمی و فکری سطح کو بلند کرنے اور ان کی اخلاقی تربیت کرنے کا بیڑہ اٹھایا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ قوم جو مغربی تعلیم کے نام سے بیخ پا ہو جاتی تھی اور نئے حالات کی روشنی میں اپنے معاملات پر غور کرنے کے لیے تیار نہ تھی اس میں ایک ذہنی انقلاب سرسید کے اس پرچے کے ذریعے آیا۔ سرسیّد نے ۷ر فروری ۱۸۸۳ء کو جالندھر میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

'' 'تہذیب الاخلاق' کا پرچہ اس لیے جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے۔اب ہندوستانیوں کی زبان سے قومی ترقی اور قومی ہمدردی کے کچھ الفاظ نکلے ہیں۔ اخباروں میں قومی ترقی اور قومی بھلائی کے آرٹیکل نظر آنے لگے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پرچے 'تہذیب الاخلاق' نے اپنا کام پورا کیا۔''(۷)

سرسیّد کی تقریر کے دس سال بعد ڈپٹی نذیر احمد 'تہذیب الاخلاق' کی خدمات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ اسے رسالے کی ہی وجہ سے تھا کہ(۸):

☆ قوم،قومی ہمدردی،قومی خیر خواہی ایسے الفاظ ہمارے روزمرہ میں داخل ہوئے۔
☆ مسلمان اپنی عزت آپ کرنے لگے۔
☆ اردو لٹریچر لفاظی،جھوٹے مبالغے،خوشامد اور ابتذال سے پاک ہوگیا۔
☆ ایشیائی شاعری کے ناپاک خیالات کی جگہ نیچرل شاعری نے رواج پایا۔
☆ علوم کی قدر ہونے لگی۔
☆ لوگوں کو اپنے خیالات آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کی جرأت ہوئی۔
☆ دلوں میں تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔
☆ مسلمانوں میں اجتماعی قوت کی تحریک پیدا ہوئی۔

اور آخر میں یہ کہ:

☆ اگر 'تہذیب الاخلاق' بند نہ کر دیا گیا ہوتا تو اب تک یہ ملک اور اسلامی دنیا میں ایک بہت بڑی طاقت ہوتا۔

سرسید احمد خان کے رسالے 'تہذیب الاخلاق' کی اہمیت و مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے میاں کمال الدین اپنی کتاب 'تاریخ پاک ہند' میں لکھتے ہیں کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسوم کو ختم کرنے اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان معاشرتی یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی(۹)۔عقیل دانش لکھتے ہیں:

''نصب العین کی تکمیل جس لگن،تڑپ خلوص اور وابستگی کا مطالبہ کرتی ہے اسے پیش کرنے کی سعادت ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔مسلمانان ہند کی سیاسی وسماجی تاریخ میں جن لوگوں کو یہ مقام ملا ہے ان میں سرسید سرفہرست ہیں۔سرسید کے نصب العین کی تبلیغ وترویج اور تشہیر وتکمیل کے ذرایع میں مدرسۃ العلوم اور 'تہذیب الاخلاق' بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔مسلمانانِ ہند کی نشاۃ الثانیہ میں تہذیب الاخلاق کا کردار نمایاں ہے''۔(۱۰)

تہذیب الاخلاق میں دینی بحث وفکر کے بعد سب سے زیادہ مجلس اخلاقی کے موضوع کو جگہ دی گئی۔چونکہ تہذیب الاخلاق میں مضمون نگاروں کی سچائی پر پورا زور دیا گیا اور ساتھ ہی مضامین کے دائرہ کار کو وسعت بھی بخشی یوں ہم اس رسالے کو ضابطہ اخلاق کا داعی ٹھہرائیں تو غلط نہ ہوگا۔سرسید ایک ایسے وقت مصلح بن کر سامنے آئے جس وقت واقعی اس وقت کے مسلمانوں کو ان کی ضرورت تھی۔ان کے نظریات وافکار اور وسعت النظری نے ثابت کیا کہ جو کچھ سرسید نے کہا وہ

بالکل درست اور وقت کا تقاضا تھا۔ حالانکہ انھیں بہت مخالفت ومخاصمت کا سامنا کرنا پڑا۔ کافر، ملحد، انگریزوں کا پٹھو جیسے القابات سے نوازا گیا مگر سرسید نے پرواہ نہیں کی۔ بلکہ اپنے نظریات پر ثابت قدم رہے اور اصلاح معاشرہ کا کام کرتے رہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ مخالفت کی وجہ سے ان کے عزم واستقلال میں مزید گرمی اور جوش پیدا ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی 'حیات جاوید' میں رقم طراز ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق جس زمانے میں جاری ہوا اس زمانے میں مسلمانوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسید اور ان کے رسالوں کے خلاف تھا، ایک طرف مذہبی اور دوسری طرف لادینی خیالات کے لوگ میدان میں موجود تھے۔ تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جو کہ مذہبی تعصّبات کے ساتھ وہی نسبت رکھتے تھے جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔ تہذیب الاخلاق نے متعصب مولویوں کے گروہ میں طلاطم پیدا کر دیا تھا۔''(۱۱)

سرسید احمد خان نے اردو صحافت میں اخباریت کے ساتھ علمیت کو نمایاں جگہ دی۔ ان کی تحریروں میں دعوت وتلقین اور اصلاح کو اولین درجہ حاصل ہے۔ 'تہذیب الاخلاق' میں مضامین مسلسل اور طویل ہوا کرتے تھے جس میں زیر بحث موضوع کے ہر اس پہلو کو اجاگر کیا جاتا تھا جس میں علمی اور اصلاحی چاشنی نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ تنقیدی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہو چکا ہے مگر اس میں سادگی، سلاست کا ترجمان آج بھی 'تہذیب الاخلاق' کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے سرسیّد نے مضمون لکھنے کی وہ روش قائم کی جو ان کے بعد ترقی پا کر لطیف عمدہ اور خوش گوار ادبی مضامین کی شکل میں نمودار ہوئی۔ سرسید نے فکر وادب میں جو راستہ اختیار کیا اس کو نہ خالص رومانی کہا جاسکتا ہے نہ خالص کلاسیکی۔ اس لیے ہم ان کی روش کو نوطرزِ کلاسیکیت کہہ سکتے ہیں۔ کلاسیکی ضابطہ پسندی کی حدیں بھی بہت حد تک فرسودہ ہو چکی تھیں۔ سرسید نے ان سے انحراف کرتے ہوئے ایک نیا کلاسیکی مکتب پیدا کیا جس میں عقل، توازن، مصالحت، اعتدال اور اجتماعیت کو نمایاں اہمیت دی۔ بہت سے دانشوروں اور سیاسی شخصیات نے کہا کہ سرسید کے اپنے سیاسی عزائم اور مقاصد تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے انھیں ادیب سے زیادہ ایک سیاسی مبصر اور مفکر قرار دیا۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھی اور اس لیے وہ حکمرانوں سے تعاون کرتے تھے جبکہ علماء کرام اس تعاون کے خلاف تھے۔ مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد کو بھی پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ متحدہ قومیت کی بات کی لیکن سرسید احمد خان متحدہ قومیت سے ہٹ کر مسلمانوں کی فلاح کی بات کرنے لگے تھے۔ حالانکہ دونوں راہنماؤں کو کام کرنے اور بات کرنے کے لیے الگ الگ سیاق وسباق میسر آیا۔ اے ایچ کوثر کا خیال ہے:

> ''تہذیب الاخلاق اور الہلال میں موضوعات کے اعتبار سے زیادہ فرق نہیں تھا۔ بیان اور استدلال ایک ہی طرح کا ہے لیکن نقطہ نظر میں واضح فرق تھا سرسید احمد خان مسلمانوں کو ایک علیحدہ اور منظّم قوم بنانا چاہتے تھے جبکہ ابوالکلام آزاد مسلمانوں کو متحدہ قومیت میں ضم کرنا چاہتے تھے''۔(۱۲)

سرسید احمد خان نے جب اپنا رسالہ جاری کیا اس وقت شروع میں حالات مختلف تھے اسی لیے خود سرسید بھی

شروع میں قوم سے مراد ہندوستانی قوم ہی لیتے تھے لیکن وقت کی گزران نے جب ان پر واضح کر دیا کہ یہ دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں تب ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہوا۔ ان کی سیاسی کاوشوں اور جدوجہد کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ان کی علمی بصیرت اور دوراندیشی کو داد دینا لازم ہو جاتی ہے۔

۱۸۵۸ء سے ۱۸۹۸ء کے چالیس سالہ دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی فکر اور ذوق کی تاریخ سرسید کی تحریروں میں واضح نظر آسکتی ہے۔ ہماری تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم، مذہب، سماجی اصلاح، ادب اور بڑی حد تک سیاست کی نمو پذیری میں ایسے گراں قدر حصہ ڈالا ہو جو سرسید احمد خان کا ہے۔ سرسید کے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' نے قوم کی فکری آبیاری کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور انشا کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسی کی بدولت تصنع کی جگہ سادگی اور اصلیت نے لی۔ سرسید کے پرچے نے اردو تحریروں کو قلم کی مینا کاری سے نجات دلا کر پرمغز بنایا۔ انھیں ہر معاملے میں تنقید اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اخباروں میں ہرزہ سرائی کی گئی حتیٰ کہ ان پر کفر کے فتوے بھی لگا دیے گئے مگر انھوں نے صرف اپنے مقصد کو ملحوظ خاطر رکھا اور ہماری علمی اور ادبی تاریخ گواہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہے۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۸

۲۔ سید عبداللہ، تہذیب الاخلاق کی اہمیت، مشمولہ: نگارِ پاکستان، سر سید نمبر (کراچی: محمدی منزل لیاقت آباد، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۸۹

۳۔ حامد حسن قادری، سرسید کی تصانیف اور علمی و مذہبی خدمات، مشمولہ: نگار پاکستان، سر سید نمبر، ص ۲۱

۴۔ فرمان فتح پوری، سرسید نمبر: نومبر تا دسمبر، مشمولہ: نگار پاکستان، سر سید نمبر، ص ۲۶۔۲۷

۵۔ نسیم قریشی، علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز (لکھنؤ: احباب پبلشرز، ۱۹۶۰)، ص ۱۸۶۔۱۹۰

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۷۔ تہمینہ عباس، سرسید کا نصب العین اور تہذیب الاخلاق، مشمولہ: سر سید شناسی (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۱

۸۔ نسیم قریشی، علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، ص ۱۸۸

۹۔ میاں کمال الدین، تاریخ پاك و هند (کراچی: پاکستان بک سینٹر، نیو اردو بازار، ۲۰۰۳)، ص ۱۰۹

۱۰۔ بحوالہ: تہمینہ عباس، سرسید کا نصب العین اور تہذیب الاخلاق، مشمولہ: سر سید شناسی، ص ۳۲

۱۱۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (لاہور، پنجاب اکیڈمی، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۱۲۔ اے ایچ کوثر، اردو صحافت سرسید اور پاکستان، مشمولہ: سر سید شناسی (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۷)، ص ۵۱